Research Journal Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقید

جلد نمبر 06، شمارہ نمبر 02، دسمبر- 2025

ناول التوائے مرگ میں موت کا تعطل: جدید تہذیب اور ادارہ جاتی زوال کا تنقیدی مطالعہ

The Suspension of Death in *Death with Interruptions*: A Critical Study of Modern Civilization and Institutional Decay

Muhammad Asif Raza
Lecturer, Department of Urdu
Government Sadiq Egerton Graduate College,
Bahawalpur

محمد آصف رضا
لیکچرر، شعبہ اردو
گورنمنٹ صادق ایجرٹن گریجویٹ کالج، بہاولپور

eISSN: 2789-6331
pISSN: 2789-4169

Copyright: © 2025 by the authors. This is an open access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract

This article offers a critical reading of José Saramago's novel *Death with Interruptions* (*As Intermitências da Morte*) by examining the suspension of death as a symbolic device to expose the moral, institutional, and civilizational crises of the modern world. The novel imagines a society in which death suddenly ceases to function, triggering widespread disruption across religious, political, economic, and social institutions. Through satire and allegory, Saramago reveals how modern civilization is sustained by systems that depend upon death for authority, legitimacy, and economic continuity. The study argues that the absence of death unmasks the hypocrisy, inefficiency, and moral emptiness of institutions such as the state, the church, insurance corporations, healthcare systems, and organized crime. Rather than celebrating immortality as a triumph, the novel portrays it as a condition that accelerates institutional decay and ethical collapse. Ultimately, the suspension of death functions as a critique of modern civilization's commodification of life, suffering, and mortality.

Keywords: Death; Institutional Decay; Modern Civilization; José Saramago; Power and Institutions; Civilization Critique.

حوزے ساراما گو(José Saramago)کا شمار بیسویں صدی کے اُن نمایاں ناول نگاروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے ناول کو صرف کہانی سنانے کا وسیلہ نہیں سمجھا بلکہ اسے انسانی شعور، سماجی حقیقتوں اور فکری پیچیدگیوں کے اظہار کا ایک موئثر اور بھرپور ذریعہ بنایا۔ ان کی تحریریں

انسانی افعال کی نفسیاتی پیچیدگیوں، معاشرتی جبر اور طاقت کے غیر مرئی نظاموں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ ان کے بیانیے میں فرد اور سماج کے درمیان کشمکش، ادارہ جاتی کنٹرول کی اجارہ داری اور عقیدے و منطق کے درمیان جاری باہمی تناؤ نہایت فطری انداز میں نمایاں ہوتے ہیں۔

حوزے ساراما گو کا ناول *As Intermitências da Morte* پہلی بار 2005ء میں پرتگالی زبان میں شائع ہوا، جسے بعد ازاں *Death with Interruptions* کے عنوان سے انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ جبکہ اردو میں مبشر احمد میر نے اس ناول کا ترجمہ "التوائے مرگ" کے نام سے کیا جو اکادمی ادبیات پاکستان سے 2017 میں شائع ہوا۔ یہ ناول معاصر عالمی ادب میں ایک ایسا منفرد اور فکری طور پر تہہ دار بیانیہ متعارف کرواتا ہے جو موت جیسے ازلی، ماورائی اور تہذیبی تصور کو نئی معنوی جہات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ناول اس سوال کو مرکز بناتا ہے کہ اگر موت کا عمل معطل ہو جائے تو کیا ہوگا؟ یہ مفروضہ محض سائنسی یا ماحولیاتی تبدیلی کے تصور تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کے اثرات معاشرتی، اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور ادارہ جاتی ڈھانچوں کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بیانیہ ایک ایسے وقت میں سامنے آیا جب دنیا عالمی سرمایہ داری، ٹیکنالوجی کے تسلط اور ثقافتی انحطاط جیسے مسائل کے زیرِ اثر انسانی اقدار، وجودی معنویت اور اخلاقی افق کے بحران کا سامنا کر رہی تھی۔ اس تناظر میں، ساراما گو کا یہ ناول محض ایک ادبی بیانیہ نہیں بلکہ ایک فلسفیانہ استفسار ہے، جو زندگی اور موت کے باہمی تعلق کو نئے فکری زاویے سے دریافت کرتا ہے۔

حوزے ساراما گو کا ناول التوائے مرگ ایک تخیلاتی لیکن فکری بنیاد پر استوار ایسا بیانیہ ہے جو انسان، سماج اور اس کے اداروں کے اس رویے کو عیاں کرتا ہے جو موت کے تعطل جیسی غیر معمولی صورتِ حال کے سامنے آتا ہے۔ یہ ایک ادبی تجربہ ہی نہیں بلکہ فلسفیانہ تمثیل ہے، جو انسانی وجود کی حدود، خوف، اختیار، اخلاق اور ادارہ جاتی مفادات کو تنقیدی زاویے سے پرکھتی ہے۔ ناول کا آغاز ایک چونکا دینے والے بلکہ تہذیبی اعتبار سے صدمہ انگیز واقعے سے ہوتا ہے۔ یکم جنوری کی صبح پورے ملک میں کسی ایک بھی انسان کی موت واقع نہیں ہوتی۔ نہ کوئی بیماری سے مرتا ہے، نہ کسی حادثے میں جان گنواتا ہے، نہ کسی خودکشی میں زندگی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہ خبر کسی سائنسی انکشاف یا ماورائی اعلان کے ذریعے نہیں پھیلتی بلکہ گورکنوں، ہسپتالوں اور ٹریفک وارڈنز کی سطح سے افواہوں کی صورت میں عوامی شعور تک پہنچتی ہے۔ گویا موت نے احتجاجاً یا کسی نادیدہ شعوری فیصلے کے تحت خود کو اس سرزمین سے معطل کر دیا ہو۔ یہ امر محض ایک جسمانی تعطل نہیں بلکہ ایک ایسی وجودی کیفیت ہے جو انسانی تاریخ کے کسی بھی زمانے میں ریکارڈ نہیں کی گئی۔ ناول نگار اس بے نظیر وقوعے کو درج کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "تاریخِ عالم کے چالیس ادوار کا مطالعہ کریں تو کہیں بہ طور مثال بھی ذکر نہیں ملے گا کہ اس نوع کا غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہو کہ اپنے دن و رات کے، صبح و شام کے اور پورا ایک دن موت کے بغیر گزرا ہو۔"[1]

اس واقعے کی نوعیت ایسی ہے جو قاری کو محض حیرت میں مبتلا نہیں کرتی بلکہ اسے انسانی وجود، جسمانی فنا اور روحانی تسلسل کے تصورات پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ناول کی ابتدائی فضا میں یہ حیرت جلد ہی اجتماعی رد عمل میں ڈھل جاتی ہے۔ صحافت، جسے ناول میں طنز کے ساتھ مفاد پرست ادارہ قرار دیا گیا ہے، سب سے پہلے اس خبر کو ایک انسانی فتح کے طور پر پیش کرتی ہے۔ اخبارات میں بڑی بڑی سرخیاں لگتی ہیں، تجزیے شائع ہوتے ہیں اور عوامی رد عمل کو نجات، مقدس تجربے اور خدائی رحمت جیسے الفاظ میں سمیٹا جاتا ہے۔ وزیرِ اعظم، ایک رسمی اور خوش فہمانہ بیان جاری کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''ہم جسم کے دوام کا چیلنج قبول کریں گے، اگر خداوند کی رضا یہی ہے، تو ہم ہمیشہ سجدۂ شکر ادا کرتے رہیں گے کہ اس نے اس ملک کے نیک لوگوں کو اپنے تجربے کے لیے منتخب کیا۔''[2]

یہ بیان محض ایک سیاسی رد عمل نہیں بلکہ اجتماعی لاشعور کی ترجمانی ہے، جو موت کو فنا کے بجائے ایک دشمن سمجھتا ہے اور اس کے غیاب کو نجات کا استعارہ۔ چند ہی گھنٹوں میں عوام کے گھروں پر جھنڈے لہرا دیے جاتے ہیں، ایک جشن کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور ریاست اس ناپید اموت کو قومی فخر میں تبدیل کر دیتی ہے۔ سجدۂ شکر، جھنڈے، تقریبات اور ٹی وی مباحثے سب اس بات کی علامت بن جاتے ہیں کہ انسان نے شاید وہ خواب دیکھ لیا ہے جس کی تعبیر صدیوں سے اس کی پہنچ سے باہر تھی یعنی ابدی زندگی، ابدی زندگی کا یہ سنہرا خواب جلد ہی قابوس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ موت کے تعطل سے سب پہلے مذہب نظریاتی بحران کا شکار ہوتا ہے۔ ناول میں یہ واضح طور پر دکھایا گیا ہے کہ جیسے ہی موت کا عمل رکتا ہے، کلیسا کے مرکزی عقائد نجات، قیامت، گناہ، توبہ اور آخرت سب غیر متعلق ہو جاتے ہیں۔ وزیر اعظم کے سجدہ شکر اور دائمی زندگی کو خدائی انتخاب قرار دینے والے بیان پر کارڈینل شدید برہم ہوتا ہے اور اسے مذہب کی توہین قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''موت بغیر، جی اٹھنا نہیں اور جی اٹھنے کے بغیر کلیسا نہیں، اس طرح کی سوچ سوفی صد بے حرمتی، شاید مذہب کی بدترین توہین ہے۔''[3]

یہ اقتباس کلیسا کے عقائد کی بنیادوں کو ظاہر کرتا ہے جو موت کی حتمیت اور آخرت کی جزا و سزا پر استوار ہیں۔ سارا ما گو نے خود بھی ایک انٹرویو میں یہی نکتہ واضح کیا:

> ''کلیسا کو اپنی بقا کے لیے موت کی ضرورت ہے... مسیحی مذاہب موت پر پلتے ہیں۔ اگر موت اپنا ظہور معطل کر دے تو وہ بنیاد بیٹھ جائے گی۔ جس پر کلیسا کا عالی شان انتظامی، مذہبی، نظریاتی اور استبدادی ایوان سجا ہے...''[4]۔

Research Journal
Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقید

جلد نمبر 06، شمارہ نمبر 02، دسمبر- 2025

یہ بیان دراصل اس فکری بنیاد کو منہدم کرتا ہے جو صدیوں سے مذہبی بیانیے کو دوام عطا کرتی رہی ہے۔ اگر انسان مرے گا ہی نہیں تو مذہب کے وہ تمام تصورات جو موت کے بعد کی زندگی پر استوار ہیں، وہ بے بنیاد اور مہمل ہو جائیں گے۔ موت کا تعطل صرف جسمانی وجود کا نہیں بلکہ مذہبی اداروں کے اخلاقی جواز کا بھی تعطل ہے۔ ناول میں کارڈینل کی شخصیت صرف ایک مذہب کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ ان تمام مذاہب کی نمائندگی کرتا ہے جو موت اور نجات کے باہمی تعلق کو مقدس مانتا ہے گویا موت کا خوف ہی وہ بنیاد ہے جو مذہبی عقیدے کو جواز عطا کرتا ہے اور جب وہ خوف ختم ہو جاتا ہے تو مذہب ایک تصوراتی نظام بن کر رہ جاتا ہے، جس کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ناول میں کلیسا کی نمائندگی کرنے والے مرکزی مذہبی کردار ہے۔[4] اس بحران کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے ایک ایسی روحانی مہم کا آغاز کرتا ہے جس کا مقصد موت کی واپسی کے لیے دعا، عاجزی اور اجتماعی استغفار کو ذریعہ بنانا ہے۔ گویا موت اب صرف ایک فطری عمل نہیں رہی بلکہ مذہب کی بقا اور جواز کی بنیادی شرط بن چکی ہے۔ یہ نکتہ اس لیے بھی اہم ہے کہ ناول اس ادارہ جاتی انحطاط کو دکھاتا ہے۔ وہ کلیسا کی ہمہ گیر طاقت کو اس وقت بے بس دکھاتا ہے جب اس کے پاس موت سے متعلق کوئی وضاحت باقی نہیں رہتی۔ مذہب، جو لوگوں کو موت کے بعد نجات کا وعدہ دیتا تھا، اب خود موت کی غیر موجودگی میں ایک خالی ڈھانچہ محسوس ہوتا ہے۔

موت کے تعطل کا ایک فوری اور عملی اثر معاشرے کی ان صنعتوں پر پڑتا ہے جن کا وجود ہی موت سے وابستہ ہے۔ ان میں سب سے پہلا اور شدید متاثر ہونے والا شعبہ تجہیز و تکفین کا ہے، جو صرف ایک مذہبی یا ثقافتی فریضہ ہی نہیں، بلکہ ایک مکمل معاشی ڈھانچہ بھی ہے، جس سے ہزاروں افراد کا روزگار وابستہ ہوتا ہے۔ ناول التوائے مرگ میں اس صنعت کا بحران نہایت طنزیہ اور دردمندانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ موت کا عمل بند ہو چکا ہے، تجہیز و تکفین کے کاروباری حلقوں میں اضطراب کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ گورکن، کفن فروش، تابوت ساز، قبرستان کے عملے اور متعلقہ اداروں کے مالکان اجتماعی طور پر آہ و بکا کرنے لگتے ہیں:

> ''اولین باضابطہ شکایت تکفین و تدفین کے کاروبار سے متعلقین کی جانب آئیں، جو اپنے روزی کے بنیادی ذریعے سے محروم کیے گئے تھے، مالکان نے روایتی انداز میں اپنے سروں پر ہاتھ رکھ لیے اور اجتماعی طور پر آہ و بکا 'اب ہمارا کیا بنے گا' شروع کر دی۔''[5]

یہ اقتباس نہ صرف ان کاروباری طبقوں کے بے بسی کو ظاہر کرتا ہے، بلکہ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ معاشی نظام کس قدر موت جیسے انسانی سانچے پر انحصار کرتا ہے۔ یہاں موت کا نہ آنا محض ایک طبی، اخلاقی یا روحانی مسئلہ نہیں رہتا بلکہ ایک معاشی سانحہ بن جاتا ہے۔ تجہیز و تکفین کی کمیٹی اس مسئلے کا حل تلاش کرتے ہوئے نہایت عجیب و غریب تجویز پیش کرتی ہے:

"حکومت قدرتی یا حادثاتی موت کا شکار ہونے والے، تمام پالتو جانوروں کی تدفین یا کریا کرم قانوناً لازمی قرار دے، یہ عمل تکفین و تدفین کی صنعت سرانجام دے۔"[6]

یہ تجویز اپنے طنزیہ پیرائے میں نہ صرف انسان اور جانور کے درمیان قدر کی تفریق کو مٹاتی ہے بلکہ معاشی ضروریات کے سامنے مذہبی رسومات کی بے توقیری کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ ساراما گو دراصل یہاں یہ نکتہ ابھارتا ہے کہ جب انسان کے اقتصادی مفادات خطرے میں ہوں تو وہ نہ صرف تہذیبی اقدار بلکہ حیات و ممات کی حرمت کو بھی قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس سارے منظر نامے میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ موت کی غیر موجودگی نے انسان کی معاشی ناتوانی کو آشکار کر دیا ہے۔ موت، جو ہمیشہ غم، دکھ اور مذہبی تقدس کی علامت سمجھی جاتی تھی، اب اس کے نہ آنے سے معاشرے کے بعض طبقات ماتم کناں ہیں گویا زندگی ان کے لیے بحران بن گئی ہے۔

تجہیز و تکفین کی صنعت کے بعد اگر کسی ادارے کو موت کے تعطل سے سب سے زیادہ مالی نقصان پہنچتا ہے تو وہ بیمہ کمپنیاں ہیں، جن کا وجود ہی انسان کی فنا کے امکان پر قائم ہے۔ زندگی کا بیمہ ایک ایسا معاہدہ ہوتا ہے جس میں موت ایک متوقع واقعہ کے طور پر فرض کی جاتی ہے اور اسی امکان کی بنیاد پر مالی تخمینے، اقساط اور معاوضے متعین کیے جاتے ہیں۔ جیسے ہی ناول کے فرضی ملک میں موت کا سلسلہ رک جاتا ہے، بیمہ کمپنیوں کے تمام تخمینے، پالیسیز اور اصول مکمل طور پر غیر مؤثر ہو جاتے ہیں کیوں کہ اب نہ کوئی مرتا ہے، نہ کوئی رقم وصول کرتا ہے اور نہ ہی موت کے بعد کسی معاہدے کی تکمیل ممکن ہے۔ ناول میں بیمہ کمپنیوں کی پریشانی کو ایک نہایت دلچسپ اور طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بیمہ کمپنیوں کی فیڈریشن کے صدر پریس کو مخاطب کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انہیں ہزاروں خطوط موصول ہو رہے ہیں، جن میں پالیسی ہولڈرز یکساں الفاظ میں زندگی کی بیمہ پالیسی کی فوری منسوخی کا مطالبہ کر رہے ہیں "ہماری صنعت کو ایک بھیانک خطرہ لاحق ہے"[7] اگر موت ہی نہیں، تو وہ مزید اقساط کیوں ادا کریں؟ ایک پالیسی ہولڈر واضح الفاظ میں لکھتا ہے: "مجھے دولت نالی میں نہیں بہانی۔"[8] اسی منظر نامے کے پیش نظر تجہیز و تکفین کی صنعت کی طرح بیمہ کمپنیوں نے بھی ایک حل نکالا:

"اسیویں سالگرہ منائے، اس وقت وہ ایک ایسا فرد ہو گا جو مجازی الفاظ میں، مردہ ہو گا، اسے معاہدے میں طے شدہ تمام رقم ادا کی جائے گی۔"[9]

یہاں انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی "قانونی طور پر مردہ" قرار دیا جا رہا ہے گویا موت کا تعطل ایک ایسا وجودی بحران بھی پیدا کرتا ہے جس میں قانونی، اخلاقی اور مالیاتی شناختیں آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ اب نہ صرف زندگی اور موت کے درمیان فرق مٹ گیا ہے بلکہ ادارے بھی ایسی اصطلاحات گھڑنے لگے ہیں جن سے وہ موت کی غیر موجودگی میں بھی اس کا فائدہ اٹھا سکیں۔ موت کے تعطل نے صرف مذہب، معیشت اور انشورنس کی بنیادوں کو ہی متاثر نہیں کیا، بلکہ اس نے صحت اور فلاحی اداروں کو بھی ایسی الجھن میں مبتلا کر دیا ہے جس کا کوئی فوری حل دستیاب

نہیں۔ ہسپتال اور اولڈ ہاؤسز اس بحران کے سب سے نمایاں مظاہر بن کر سامنے آتے ہیں، جہاں زندگی اور موت کے درمیان معلق وجود معاشرتی بوجھ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کا جسم تو زندہ ہوتا ہے، مگر نہ وہ مکمل صحت مند ہوتا ہے، نہ مرنے کے قابل اور نہ ہی کسی فعال کردار کے قابل۔ ناول میں ہسپتالوں کے منتظمین اور طبی عملے کی بے بسی نہایت دقیق اور طنزیہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔

> ''ہر دو سرکاری اور نجی اقامتی اسپتالوں کے ڈائریکٹرز اور ایڈمنسٹریٹرز جلد ہی متعلقہ وزیر، وزیرِ صحت کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے کہ اپنی عوامی خدمات کے ساتھ اپنی پریشانیوں اور بے چینیوں کے بارے میں بتائیں...''۔[10]

یہ پریشانیاں طبی سہولیات کی کمی سے زیادہ اس حقیقت کی غماز ہیں کہ موت کا نہ آنا اب صرف ایک اخلاقی یا وجودی سوال نہیں بلکہ نقل و حرکت، بستر اور جگہ کی قلت جیسے انتظامی بحران میں تبدیل ہو چکا ہے۔ راہداریوں میں بستروں کا پھیلنا، معمول سے زیادہ قیام پذیر مریضوں کی موجودگی اور مریضوں کے داخلے و اخراج کے قدرتی تسلسل کا ٹوٹ جانا یہ سب اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ایک غیر فانی معاشرہ درحقیقت بے عمل لاشوں کا قبرستان بننے لگتا ہے۔ وہ مریض جو معمول کے حالات میں چند دن یا ہفتے میں زندگی کا اختتام کر چکے ہوتے، اب ہسپتالوں کے نظام میں پھنسے ہوئے نیم زندہ اجسام بن چکے ہیں۔ یہی بحران ہمیں ہاؤسز کی صورت حال میں بھی نظر آتا ہے، جہاں معمر اور نیم مردہ افراد کی تعداد ناقابلِ تصور حد تک بڑھ چکی ہوتی ہے اور مزید بڑھنے کا اندیشہ لاحق ہے:

> ''وقت گزرنے کے ساتھ، ان ضعیف خانوں میں صرف بوڑھوں کی کثیر تعداد ہی مقیم نہیں ہوگی بلکہ ان کی نگہداشت کے لیے مزید افراد، پھر مزید اور افراد کی ضرورت ہوگی... ایک پر دوسرا، جیسے گزشتہ خزاں میں گرنے والے پتوں پر درختوں سے گرنے والے پتے...''۔[11]

یہ تشبیہ ناول کی علامتی سطح پر ایک ایسے مستقبل کا خوفناک خاکہ پیش کرتی ہے جس میں زندگی اپنی حرکی معنویت کھو دیتی ہے اور نسل در نسل لوگ صرف اس لیے زندہ رہتے ہیں کہ وہ مر نہیں سکتے۔ جوان نسلیں اپنی زندگی کا بہترین وقت ان فرتوت جسموں کی خدمت میں صرف کرتی ہیں، جن کا نہ کوئی مستقبل ہے، نہ مقصد اور نہ ہی کوئی حتمی انجام۔ انبوہ کثیر بوڑھوں کی یہ صفیں صرف وقت کو کاٹ رہی ہیں، جیسے انسان ارتقاء کے سفر سے پیچھے ہٹ کر ایک بوجھ زدہ بقا کی طرف لوٹ رہا ہو۔ زندگی کی طوالت انسانیت کی زوال پذیری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہسپتال، جو شفا کے مراکز تھے، اب ناقابلِ نکاسی لاشوں کے انبار بن چکے ہیں اور اولڈ ہاؤسز، جو کبھی احترامِ عمر رسیدگی کی علامت تھے، اب ایک بوجھل سماجی حقیقت میں بدل چکے ہیں۔

Research Journal Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقید

جلد نمبر06، شمارہ نمبر02، دسمبر-2025

موت کا تعطل صرف اداروں کو ہی نہیں بلکہ انسانی تعلقات اور سماجی اقدار پر بھی گہرے اور اذیت ناک اثرات مرتب کرتا ہے۔ ناول التوائے مرگ میں یہ پہلو نہایت خاموش لیکن دل دہلا دینے والے انداز میں ابھرتا ہے، جہاں محبت، قربانی اور وفاداری جیسے جذبات رفتہ رفتہ بوجھ، مجبوری اور نفرت میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں کبھی عزیز سمجھا جاتا تھا، جن کے ساتھ زندگی کے حسین لمحے بتائے گئے تھے، وہی اب موت کے تعطل کی صورت میں ایک ناقابلِ برداشت ذمہ داری میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ سارا ماگو دکھاتا ہے کہ زندگی کی طوالت نعمت نہیں بلکہ ایسی اذیت بھی بن سکتی ہے جو انسان کو اپنے عزیزوں سے بیزار کر دے۔ ناول میں ایک نحیف، نیم مردہ بوڑھا شخص اپنی بیٹیوں اور داماد سے التجا کرتا ہے کہ وہ اسے ملک کی سرحد پار لے جائیں، جہاں موت اب بھی فعال ہے تاکہ وہ اس عذاب سے نجات پا سکے۔ یہ واقعہ محض ایک خاندانی فیصلہ نہیں بلکہ سماجی زوال کی گواہی ہے، جس میں محبت کا جذبہ ہمدردی کی بجائے بوجھ سے نجات کی شکل اختیار کر لیتا ہے:

> ''ہم آپ کی زندگی چاہتے ہیں، موت نہیں لیکن میری موجودہ حالت میں نہیں، زندہ لیکن مردہ، مردہ لیکن بہ ظاہر زندہ۔''[12]

یہ جملہ انسانی وقار، آزادی اور درد کی ایسی انتہا کو چھوتا ہے جہاں موت، زندگی سے کہیں زیادہ باعزت اور مرغوب معلوم ہوتی ہے۔ جیسے ہی اس شخص کی موت واقع ہوتی ہے، میڈیا میں اس واقعے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ معاشرہ، جو پہلے اس فعل کو قابلِ مذمت سمجھتا تھا، اب اسے ایک قابلِ عمل حل کے طور پر اپنانے لگتا ہے:

> ''صرف اڑتالیس گھنٹے بعد تمام سرحدی علاقوں سے اسی طرح کے واقعات کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ چھکڑے اور خچر دوسرے ناقابلِ دفاع جسموں کو منتقل کر رہے تھے۔''[13]

یہ منظر محض موت کی تجارتی منتقلی نہیں بلکہ ایک اجتماعی اخلاقی پسپائی کی علامت ہے۔ لوگ اب اپنے پیاروں کو زندگی کے تحفظ کے نام پر نہیں بلکہ موت کے حق کے حصول کے لیے سرحد پار روانہ کرتے ہیں۔ انسانیت کا وہ پہلو، جو ہمیشہ محبت، تیمارداری، قربانی اور وفاداری کے ساتھ جڑا تھا، اب محض انتظامی اور مالیاتی فیصلوں میں بدل گیا ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں انسان موت سے نہیں بلکہ زندگی کے طول پکڑنے سے خوف زدہ ہو جاتا ہے اور یہ خوف اسے اس حد تک لے جاتا ہے کہ وہ خود اپنی اقدار کی قبریں کھودنے لگتا ہے۔ ناول التوائے مرگ میں حوزے سارا ماگو ہمیں ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں موت کے تعطل سے پیدا ہونے والا خلا صرف انسانی یا سماجی بحران تک محدود نہیں رہتا بلکہ رفتہ رفتہ ریاست، سیاست اور غیر ریاستی طاقتوں کے بیچ ایک ایسا بیوروکریٹک معاہدہ تشکیل پاتا ہے جو تہذیبی اصولوں، انسانی وقار اور قانونی اقدار کو مکمل طور پر پامال کر دیتا ہے۔ جب موت اپنا کام روک دیتی ہے، تو ریاست خود کو ایک ایسے چیلنج کے سامنے پاتی ہے جس کا حل نہ اس کے آئین میں ہے، نہ اس

Research Journal Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقید

جلد نمبر06، شمارہ نمبر02، دسمبر- 2025

کے قانون میں، نہ اس کی اخلاقیات میں اور جب ریاست اپنی طاقت سے، اپنی دانش سے اور اپنے اخلاقی ذرائع یعنی مذہب سے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو وہ مافیا کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔

ابتدا میں جب شہری اپنے نیم مردہ عزیزوں کو سرحد پار لے جانے لگتے ہیں تو حکومت اس غیر قانونی عمل پر سخت ردعمل ظاہر کرتی ہے۔ سرحدوں پر فوج تعینات کی جاتی ہے، نگرانی بڑھادی جاتی ہے اور زندگی کو قانونی دائرے میں واپس لانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن جلد ہی ریاست کو احساس ہو جاتا ہے کہ وہ اس بحران پر قابو پانے میں مکمل طور پر ناکام ہے۔ اس موقع پر مافیا جو "ماپیا" کے نام سے ایک نیا چہرہ اختیار کر چکی ہوتی ہے، منظر میں داخل ہوتی ہے ایک عام جرائم پیشہ تنظیم اور ایک انتظامی متبادل کے طور پر۔ وہ ریاست کو وہی کچھ دینے کی پیشکش کرتی ہے جو وہ خود نہیں دے سکتی: نظم، تدفین، امن اور موت کا فعال بندوبست۔ یہاں ایک ایسا تاریخی لمحہ آتا ہے جب ریاست اور مافیا کے درمیان ایک زبانی معاہدہ طے پاتا ہے، جس کے تحت مافیا شہریوں کو سرحد پار منتقل کرتی ہے، مرنے کے بعد ان کی لاشیں واپس لاتی ہے اور تدفین کا مکمل انتظام کرتی ہے تمام ریاستی اداروں کے تعاون سے۔ ساراماگو اس منظر کو طنزیہ مگر انتہائی سنجیدہ لہجے میں یوں بیان کرتا ہے:

> ’’آپ سوچ سکتے ہیں، حکومت کی جانب سے ماپیا کے ساتھ کیا گیا شرم ناک اطاعت گزاری کا معاہدہ،
> اتنا آگے جاتے ہوئے کہ عاجز، ایماندار سرکاری ملازمین کل وقتی کام کریں جرائم پیشہ آرگنائزیشن
> کے لیے۔‘‘[14]

یہ محض کسی ایک ملک یا حکومت پر طنز نہیں بلکہ جدید ریاستی نظام پر ایک نقادانہ ضرب ہے، جہاں قانونی ادارے بظاہر اخلاقیات کے محافظ ہوتے ہیں مگر عملاً وہی کام انجام دیتے ہیں جو کبھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ موت جو ایک مقدس اور ناقابلِ اختیار حقیقت تھی اب مافیا کی انتظامی مہارت کے ذریعے ایک قابلِ نظم ادارہ بن چکی ہے۔ اس انتظامی نظام میں ڈاکٹروں کی تعیناتی، لاشوں کی منتقلی، تدفین کی دستاویزات اور یہاں تک کہ اجتماعی شاخوں کی تشکیل جیسے مراحل بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہاں مافیا ایک نئی ریاست کا کردار ادا کرتی ہے اور ریاست خود معذور قانون کی علامت بن جاتی ہے۔ جیسے ہی موت اپنی سرگرمیاں روک دیتی ہے، معاشرے میں ایک وقتی حیرت، مسرت اور نجات کا احساس پیدا ہوتا ہے گویا انسان کو ازلی حیات کا خواب مل گیا ہو لیکن جلد ہی یہ خواب ایک بھیانک المیے میں تبدیل ہو جاتا ہے، جہاں زندگی کی معنویت، جو ہمیشہ موت کی ضد میں سمجھی جاتی تھی، تحلیل ہونے لگتی ہے۔

حوزے ساراماگو کا ناول التوائے مرگ محض موت کے غائب ہو جانے کی خیالی صورت حال کا بیانیہ نہیں بلکہ یہ ایک تہذیبی احتساب ہے، جو بظاہر مہذب مگر باطن میں مفاد پرست اور خود غرض تمدنی ڈھانچوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ جیسا کہ ان کے دوسرے معروف ناول اندھے لوگ میں 'اجتماعی اندھے پن' کو علامتی انداز میں انسانی شعور اور سماجی بصیرت کی ناکامی کے طور پر پیش کیا گیا، التوائے مرگ میں بھی موت کا تعطل

ایک ایسی علامت ہے۔ جس کے ذریعے انسانی تہذیب، سماجی اقدار، مذہبی اصول اور سیاسی ادارے اپنی اصل حقیقت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یوں التوائے مرگ ایک سادہ تخیلاتی مفروضے سے آگے بڑھ کر اہم ترین تمدنی اجزا پر ایک گہری فکری ضرب لگاتا ہے اور موت کے التوا کے پردے میں انسانی تمدن کی منافقت، خود غرضی اور اخلاقی زوال کو آشکار کرتا ہے۔

جب موت اپنی سرگرمیاں روک دیتی ہے تو انسانی تہذیب کا نقاب اترنے لگتا ہے۔ اس کا سب سے گہرا اور فوری اثر ان اداروں پر پڑتا ہے جن کی بنیاد ہی موت اور مابعد الموت بیانیے پر استوار ہے، جن میں مذہب سرفہرست ہے۔ مذہب صدیوں سے موت کو ایک عبوری دروازہ تصور کرتا رہا ہے یعنی ایک ایسی راہ گزر جہاں سے گزر کر انسان ابدی زندگی، نجات اور خدا کی ملاقات کی طرف بڑھتا ہے۔ اس بیانیے میں موت کو محض خاتمہ نہیں بلکہ ایک نئے وجود کی ابتدا سمجھا گیا ہے۔ اس لیے مذہب کے تمام تصورات قربانی، کفارہ، دعا، گناہ، ثواب، نجات اور قیامت سب موت کے تسلسل پر منحصر ہوتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی ناول التوائے مرگ میں موت کا عمل رک جاتا ہے، اس پورے مذہبی ڈسکورس کی بنیادیں ڈھے جاتی ہیں۔ حوزے ساراما گو نے اس بحران کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے۔ جیسے ہی وزیر اعظم یہ بیان دیتا ہے کہ موت اب نہیں آئے گی، چرچ کا نمائندہ، کارڈینل، شدید اضطراب اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے اور اسے توہین مذہب قرار دیتا ہے:

"اس طرح کی سوچ سو فیصد بے حرمتی، شاید مذہب کی بدترین توہین ہے۔"[15]

یہ جملہ خود مذہب کی وجودی بے یقینی کو ظاہر کرتا ہے۔ موت کے بغیر قیامت ممکن نہیں، قیامت کے بغیر نجات اور ابدی زندگی کا وعدہ جھوٹ ثابت ہوتا ہے اور جب یہ وعدہ غیر معتبر ہو جائے تو مذہب کی تمام اخلاقی بنیادیں خالی ڈھانچوں میں بدل جاتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ناول میں تمام مذاہب کی نمائندگی کرنے والے بشپ، کلیسا کی قیادت میں موت کی واپسی کے لیے دعاؤں کی مہم کا آغاز کرتے ہیں اور موت کو واپس بلانے کے لیے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھالیتا ہے۔ موت اب کوئی روحانی راز یا الٰہی ارادہ نہیں بلکہ مذہب کے لیے ایک عملی ضرورت بن جاتی ہے۔ ساراما گو دراصل مذہب کی اس دوہری پالیسی کو بے نقاب کرتے ہیں کہ وہ اخلاقیات کے نام پر قائم ہونے کے باوجود وقت آنے پر مفادات، طاقت اور وجودی تحفظ کو فوقیت دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مذہب کی اخلاقی و روحانی معنویت بالکل غائب ہو جاتی ہے اور وہ ایک مفاد پرست ادارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو اپنے بیانیے کی بقا کے لیے اسی موت کا طلبگار ہو جاتا ہے جس کے خلاف وہ صدیوں سے وعظ کرتا رہا ہے۔ یہ اخلاقی زوال ہمیں اس بنیادی نکتہ کی طرف لے جاتا ہے کہ جب ادارے چاہے وہ مذہبی ہوں یا سیاسی اپنی معنویت کھو بیٹھیں اور صرف مفاد پرستی کے محور پر گھومنے لگیں، تو وہ نہ صرف اپنے وجود کا جواز کھو بیٹھتے ہیں بلکہ اس تہذیب کو بھی کھوکھلا کر دیتے ہیں جس کے وہ نگہبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ناول کا یہ بیانیہ مذہب کو ایک تنقیدی آئینے میں رکھتا ہے جہاں وہ نجات کے راستے کی بجائے، ایک ایسا مفاداتی ادارہ بن جاتا ہے جو موت کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ التوائے مرگ میں مذہب کے اس رویہ کو بھی نمایاں کیا گیا ہے جو اخلاقی بصیرت سے محروم ہو کر محض روایتی

اطاعت، رسمی عبادات اور خود فریبی کا سہارا لینے لگتا ہے۔ جب کلیسا اور اس کے نمائندے موت کی غیر موجودگی کے اس غیر معمولی واقعے کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، تو وہ اس کو ایک الٰہی آزمائش قرار دے کر خود کو تسلی دینے لگتے ہیں:

> "ایک دن ہم جان جائیں گے، اس نے ہمیں اس آزمائش میں کیوں ڈالا، اس دوران میں ہم مقدس مریم کی تمجیدی تسبیح جاری رکھیں گے۔"[16]

یہ جملہ محض مذہبی اطاعت نہیں بلکہ اس فکری جمود کا اظہار یہ ہے جس میں ادارہ جاتی مذہب مبتلا ہو چکا ہے۔ یہ تسبیح دراصل اس فکری تعطل کی علامت ہے جس میں سوال اٹھانا، تحقیق کرنا اور نئے معنوں کی تلاش ترک کر دی گئی ہے۔ ساراماگو یہاں اس روحانی جمود کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ جب ایک تہذیبی بحران مذہب کے دروازے پر آ کھڑا ہوتا ہے، تو اس کے نمائندے حقیقت کا سامنا کرنے کی بجائے رسمی اذکار، روایتی عبادات اور خود فریبی میں پناہ لینے لگتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مذہب، بجائے روشنی دکھانے کے، اندھیرے میں پناہ گزین ہو جاتا ہے اور ساراماگو اسی اندھیرے میں مذہب کی اخلاقی کمزوری اور اس کی مفاداتی ہئیت کو بے نقاب کرتے ہیں۔

التوائے مرگ موت کے تعطل کا ایک فرضی بیانیہ نہیں بلکہ جدید تہذیب کی روحانی و اخلاقی ویرانی کا ایک گہرا اور فکر انگیز استعارہ ہے۔ ناول میں موت کا یہ تعطل ایک ایسے تہذیبی بحران میں تبدیل ہو جاتا ہے جو سماج کے ہر حصے کو متاثر کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ساراماگو جدید دنیا کی روحانی اور تہذیبی بے حسی کو طنزیہ بیانیے کے ذریعے بے نقاب کرتے ہیں۔ وہ ہمیں دکھاتے ہیں کہ جدید معاشرے میں موت بھی ایک منڈی کا خام مال بن چکی ہے، جہاں انسان کے جسم سے بڑھ کر اس کی موت کی معاشی قیمت لگائی جاتی ہے۔ ناول میں موت کے نہ ہونے کو خام مال کی کمی قرار دیا جاتا ہے تو یہ اصطلاح بظاہر سفاک اور غیر انسانی محسوس ہوتی ہے لیکن یہی اس بیانیے کا بنیادی تنقیدی طنز ہے۔ کیوں کہ یہ وہ سچ ہے جس پر آج کی جدید سرمایہ دار تہذیب کی عمارت قائم ہے۔ جیسا کہ بھارتی محققہ دیوالینا کنڈو (Devaleena Kundu) نے لکھا ہے:

> "Even an intricately personal-cum-social event such as death is now subjected to the economic gaze."[17]

درج بالا اقتباس اس وسیع سچائی کو بیان کرتا ہے کہ اب موت، جو کبھی روحانی، جذباتی اور خاندانی وابستگیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی، اب ایک صنعتی سرگرمی میں تبدیل ہو چکی ہے، جہاں زندگی کا خاتمہ بھی مالیاتی تجزیے اور ادارہ جاتی ضوابط کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ موت کے رک جانے سے تدفینی ادارے اور مذہبی نظام لرز اٹھتے ہیں، وہیں بیمہ کمپنیاں بھی ایک شدید بحران کا شکار ہو جاتی ہیں بیمہ کمپنیاں اپنی بقا کے لیے زندہ انسانوں کو مردہ قرار دینے کی ایک عمر متعین کر دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں زندگی اور موت کے درمیان کی اخلاقی لکیر مٹ جاتی ہے۔ ان کمپنیوں کے نزدیک انسان صرف اس وقت زندہ ہے جب وہ کاروباری طور پر فائدہ مند ہو؛ بصورت دیگر وہ محض ایک خسارہ ہے، جس سے چھٹکارا پالیسی منسوخ کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ تہذیبی بحران ہے جس پر ساراماگو کی تنقید مرکوز ہے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح جدید دنیا میں

زندگی اور موت جیسے فطری اور انسانی مظاہر بھی مارکیٹ کے تابع ہو چکے ہیں۔ جب زندہ اور مردہ انسانوں میں فرق ختم کر دیا جائے صرف اس لیے کہ کمپنی کا مالی توازن متاثر نہ ہو تو یہ کسی ایک ادارے کی بے حسی نہیں بلکہ پوری تہذیب کی اخلاقی دیوالیہ پن کی علامت ہے۔

ناول التوائے مرگ میں انشورنس کمپنیوں کی تشویش، تدفینی اداروں کا معاشی بحران اور مذہبی اداروں کی خاموش پریشانی اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ جدید دنیا میں موت سے وابستہ پورا نظام ایک متوازی معیشت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ دائمی زندہ مریض، جن کی نگہداشت نہ صرف جسمانی مشقت ہے بلکہ مالی بوجھ بھی۔ ایسے حالات میں خاندان کے افراد اور معاشرتی ادارے مکمل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ ساراماگو اس بے حسی کو صرف سماجی یا اقتصادی مسئلہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک تہذیبی انہدام کے طور پر پیش کرتے ہیں جہاں موت کی غیر موجودگی انسانی وقار، خدمتِ خلق اور باہمی رشتوں کی معنویت کو نگلنے لگتی ہے۔ وہ اس تمام بحران کو تہذیب کے اس مقام سے جوڑتے ہیں جہاں انسانی دکھ بھی صرف ایک مالی قدر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ چناں چہ موت کا تعطل خود زندگی کی روحانی حرمت پر ایک سوالیہ نشان بن کر ابھرتا ہے۔

ریاستی اداروں کی نااہلی اور بیوروکریسی کا تماشائی کردار ناول التوائے مرگ میں ایک ایسی تمثیلی شکل اختیار کر لیتا ہے جو نہ صرف پرتگالی یا مغربی سیاست پر طنز ہے بلکہ بالعموم تیسری دنیا کی سیاسی نفسیات کی علامت بھی بن جاتی ہے۔ جیسے ہی موت کا عمل رک جاتا ہے، یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ ریاست اس بحران کا سنجیدگی سے جائزہ لے کر عملی اقدامات کرے گی، مگر ناول میں ہمیں جو ردِ عمل نظر آتا ہے وہ نہایت بچگانہ، نمائشی اور غیر سنجیدہ ہے۔ موت جیسے سنگین مسئلے سے نمٹنے کے لیے حکومت کا پہلا قدم یہ ہوتا ہے کہ ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی جائے، جو موت کی تلاش کرے۔ اس ضمن میں ایک فنکار سے موت کا فرضی خاکہ بنوایا جاتا ہے تاکہ عوام اور اداروں کو اس کی شناخت کروائی جا سکے ایک ایسا مذاق جو ریاستی سنجیدگی پر شدید طنز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بیانیہ دراصل اس بڑے سیاسی سوال کو سامنے لاتا ہے کہ جب ریاستی طاقت، سنجیدگی اور تدبر سے عاری ہو جائے تو وہ محض بیوروکریسی کی سرکس بن کر رہ جاتی ہے۔ ساراماگو یہاں جس طنزیہ لہجے کا سہارا لیتے ہیں، وہ دراصل اُن حکومتوں کی نمائندگی کرتا ہے جو ہر بڑے بحران کے جواب میں صرف نمائشی اقدامات کرتی ہیں۔ ایک طرف عوام کی زندگیاں، ادارے، معیشت اور مذہبی ڈھانچے زوال کا شکار ہو رہے ہوتے ہیں اور دوسری طرف ریاست محض 'کمیٹی تشکیل دینے' اور 'تصاویر بنوانے' جیسے لاحاصل عمل میں مصروف رہتی ہے۔

حکومت کی یہ غفلت دراصل ایک بڑی علامت ہے۔ وہ علامت کہ جب کسی ریاست میں طاقت کا مرکز صرف کرسی یا دفتر میں محدود ہو جائے اور اس کے فیصلے عوامی فلاح کی بجائے خود کو بچانے کے لیے کیے جائیں، تو وہ ریاست ایک استبدادی مگر غیر مؤثر ڈھانچہ بن جاتی ہے۔ ناول کا یہ منظر تیسری دنیا کی ان حکومتوں کا استعارہ بن جاتا ہے جو کٹھ پتلی انتظامیہ، رشوت زدہ ادارے اور نمائشی بیانات کے ذریعے حقیقی مسائل کو پسِ پشت ڈال دیتی ہیں۔ اس تناظر میں ریاست کا کردار محض ایک 'تماشائی کردار' بن کر رہ جاتا ہے۔ ناول میں ریاست نہ صرف عوامی مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہتی ہے بلکہ ان کے وجود سے بھی منہ موڑ لیتی ہے۔ موت کی واپسی کے لیے مؤثر طبی، قانونی یا انتظامی نظام بنانے کی بجائے،

وہ علامتی اور مضحکہ خیز اقدامات سے اپنی موجودگی کا جواز گھڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ یوں سارا ماگو کا طنز، ایک گہری تہذیبی تشخیص میں ڈھل جاتا ہے کہ جب ریاست اپنی اخلاقی، سیاسی اور ادارہ جاتی ذمہ داریوں سے دست بردار ہو جائے، تو اس کے بعد معاشرتی بحران محض ایک حیاتیاتی یا اتفاقی حادثہ نہیں رہتا بلکہ ایک منظم تباہی بن جاتا ہے اور یہی ناول کا بنیادی تنبیہی پیغام ہے۔

ناول التوائے مرگ کا ایک نہایت چونکا دینے والا پہلو وہ مافیا گروہ ہے جو نہ صرف موت کی اسمگلنگ کرتی ہے بلکہ اسے باقاعدہ قانونی اور مذہبی جواز فراہم کرنے کی بھی کوشش کرتی ہے۔ وہ تدفین و تکفین کی صنعت سے باقاعدہ زبانی معاہدہ کرتی ہے ہم لاشیں دیں گے، تم انھیں دفن کروگے یوں ایک مکمل سپلائی چین ترتیب پاتی ہے، جس میں ریاست، ادارے اور سرمایہ دار سب شامل ہوتے ہیں۔ ناول کا طنز اس وقت شدید تر ہو جاتا ہے جب ماپیا خود کو نجات دہندہ کے طور پر پیش کرتی ہے اور معاشرے کے باقی تمام ادارے حتیٰ کہ ریاستی مشینری بھی اس کے سامنے جھک جاتی ہے۔ ماپیا کے مفادات کا دائرہ اس وقت اور پھیلتا ہے جب موت کی واپسی کا اعلان ہوتا ہے۔ اب وہ تجہیز و تکفین کی صنعت کو دھمکاتے ہیں، ان سے تحفظ کی رقم وصول کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

> "اگر مزاحمت کی گئی تو یہ حملے منتج ہو سکتے ہیں… بشمول قتل پر مالک، منیجر، یا ان کے ملازمین پر۔۔۔
> اگر آپ چاہیں، ہم آپ کی حفاظت کر سکتے ہیں… دو شرائط ہیں: کسی کو کچھ نہ بتانا اور جو ہم کہیں وہ رقم ادا کرنا۔"[18]

یہ صورتِ حال جدید سرمایہ دارانہ فاشزم کی جیتی جاگتی تمثیل ہے جہاں طاقتور نہ صرف سماج پر حکومت کرتے ہیں بلکہ خوف کے ذریعے اخلاقی نظام کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ ناول اس زوال کو محض بیان نہیں کرتا بلکہ اس کی تہذیبی معنویت کو واضح کرتا ہے: ماپیا نے انسانی روحوں کو بگاڑا، جسموں کو مطیع بنایا اور قدروں کو تباہ کیا۔

> "ماپیا… روحوں کو بگاڑتے ہوئے ہر شعبے میں اپنے پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو گیا، جسموں کو مطیع بناتے اور باقی ماندہ پرانی قدروں کو تباہ کرتے ہوئے۔"[19]

یہ وہ مقام ہے جہاں ناول جدید سرمایہ دارانہ ریاست کو مکمل بے نقاب کرتا ہے۔ ماپیا اب محض ایک مافیا نہیں بلکہ ریاست کے متوازی ایک مکمل نظام ہے، جو امن، موت، تدفین، مذہب، قانون اور حتیٰ کہ انسانی تحفظ جیسے شعبوں کو اپنے نفع کے تابع کر چکا ہے۔ یہ صورتِ حال ہمیں حالیہ تاریخ میں بھی دکھائی دیتی ہے، جیسا کہ کرونا وبا کے دوران دیکھا گیا جہاں ادویات، آکسیجن سلنڈر، کفن، ماسک اور یہاں تک کہ قبر کی جگہ بھی منڈی کی جنس بن گئی۔ یہ وہی منطق ہے جسے سارا ماگو نے ناول میں ماپیا کے ذریعے برہنہ کیا ہے کہ سرمایہ داری ہر بحران کو مواقع میں بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کے سامنے انسانی زندگی اور موت کی کوئی حرمت باقی نہیں رہتی۔

التوائے مرگ کا ماپیا صرف ایک فکشنل گروہ نہیں بلکہ اس نظام کا عکاس ہے جہاں ریاستیں طاقتور سرمایہ داروں کے ہاتھوں کھلونا بن چکی

ہیں۔ ان کے پاس قانون، اخلاق، موت، زندگی، خدمتِ خلق ہر اصطلاح کی مارکیٹ قیمت موجود ہے۔ حوزے ساراماگو نے اس تخیل کو ایک ایسا آئینہ بنا دیا ہے جس میں ہم نہ صرف ناول کے کردار بلکہ اپنے معاصر معاشرے کی روحانی، معاشی اور سیاسی زبوں حالی کو دیکھ سکتے ہیں۔ ایسا زوال جو صرف فرد کی شکست نہیں بلکہ پورے تمدن کے چہرے سے نقاب کا اترنا ہے۔ خاندانی نظام کی شفقت، مذہب کی روحانیت، ریاست کی سرپرستی اور معاشرت کی اقدار سب کچھ سرمایہ، مفاد اور بقاء کے حیوانی اصولوں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ساراماگو قاری کو متنبہ کرتے ہیں کہ یہ ناول موت کے بارے میں نہیں، تہذیب کے زوال کے بارے میں ہے۔ یہ تہذیبی زوال دراصل ایک تہذیبی خود احتسابی ہے، جیسا کہ تانیہ جونز نے کہا:

> "Saramago's narrative is not simply a tale about the disappearance of death, but a cultural self-interrogation that exposes the hypocrisies and institutional contradictions embedded within Western civilization."[20]

یہی وہ فکری و اخلاقی دھارا ہے جو ساراماگو کے بیانیے کو ایک گہرے سیاسی، سماجی اور معاشی احتجاج میں بدل دیتا ہے۔ ناول کا اسلوب نہایت طنزیہ ہے اور اس کے مضمرات جدید دنیا کی سب سے پیچیدہ حقیقت کو افشا کرتے ہیں۔ التوائے مرگ کا دوسرا حصہ، جو پہلی نصف کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی تمثیل سے بہت مختلف ہے، ایک فرد کی سطح پر محبت، وجود اور انکار کی داستان بن جاتا ہے۔ یہاں ناول ایک وجودی موڑ لیتا ہے اور سماج کی اجتماعی تصویر سے نکل کر ایک فرد کے باطن میں جھانکنے لگتا ہے۔ کہانی کا یہ غیر معمولی باب ایک انوکھے واقعے سے شروع ہوتا ہے: وہ تمام خطوط جو موت نے لوگوں کو بھیجے تھے، ان میں سے ایک خط واپس آ جاتا ہے۔

> "وہ خط جو دو مرتبہ واپس آ چکا تھا ایک مرتبہ پھر غائب ہو گیا۔ دو منٹ کے اندر وہ واپس، وہاں، اسی جگہ، پہلے کے مانند موجود تھا۔"[21]

یہ خط ایک بار یا دو بار نہیں بلکہ چار بار واپس آتا ہے یہ ایک علامتی لمحہ ہے جہاں موت کی مطلق طاقت کو پہلی بار چیلنج کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان نے پہلی بار نہ صرف زندگی کے لیے بلکہ موت کے خلاف بھی حقِ انتخاب استعمال کیا ہو۔ موت حیران و پریشان ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ یہ کون انسان ہے جس کے اندر وہ طاقت ہے جو موت کے حکم کو مسترد کر رہی ہے۔ یہاں سے وہ فیصلہ کرتی ہے کہ اس خط کو اب کسی اور ذریعے سے نہیں بلکہ خود جا کر اس فرد کو دے گی، تاکہ اس انکار کے امکان کو ختم کیا جا سکے۔ لیکن جیسے ہی موت اس فرد ایک بے نام اور تنہا سیلو نواز کے قریب جاتی ہے، بیانیہ اپنی رنگت بدل لیتا ہے۔ یہ سیلو نواز کوئی عظیم شخصیت نہیں، نہ ہی اس کے پاس کوئی سیاسی طاقت یا سائنسی راز ہے۔ وہ صرف ایک تنہا انسان ہے جو موسیقی کی زبان بولتا ہے۔ وہ موسیقار ہے لیکن ایسا موسیقار جو لفظوں سے زیادہ نغموں میں بات کرتا ہے اور یہی وہ زبان ہے جو موت کو پہلی بار محسوس کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

"جس بات نے موت کو متاثر کیا، وہ اس کا موسیقی کے ان اٹھاون سیکنڈوں میں کسی انسانی زندگی،
بھلے کولھو کے بیل جیسی ہو یا غیر معمولی، کو سر اور تال میں ڈھلتے ہوئے"[22]

موت، جو اب ایک خوبصورت عورت کے روپ میں آچکی ہے، اس کی موسیقی سن کر خاموش، نرمی اور حیرت کے تجربات سے گزرتی ہے۔ یہاں موت پہلی بار ایک فرد کے ساتھ جسمانی و جذباتی سطح پر موجود ہوتی ہے اور اسی لمحے اس کی سرشت میں تبدیلی کا آغاز ہوتا ہے۔ موت جو ایک غیر شخصی، لااحساس، سرد وجود تھی، ایک ایسے جذبے سے دوچار ہوتی ہے جس کا وہ پہلے تجربہ نہ رکھتی تھی یعنی محبت اور احساس کا جذبہ یہی وہ مقام ہے جہاں موت اور انسان کی جدلیاتی تفہیم اب ایک نئی صورت اختیار کرتی ہے۔ سیلو نواز جو شاید خود بھی زندگی سے بیگانہ اور جذبوں سے خالی تھا اب موت کی شکل میں آنے والی اس عورت کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہاں ساراماگو صرف ایک رومانوی افسانہ نہیں سنا رہے بلکہ وہ انسانی جذبے کی الوہیت اور موت کی غیر انسانی ساخت کے درمیان مکالمہ پیدا کر رہے ہیں۔ موت محبت کرتی ہے اور محبت کے اس لمحے میں وہ خط جو وہ سیلو نواز کو دینے آئی تھی پھاڑ دیتی ہے:

"وہ خط میں ہوٹل چھوڑ آئی ہوں، حقیقت یہ ہے کہ اگر میں اسے آپ کو دینا چاہتی تو بھی نہ دے پاتی
مسکراتے ہوئے عورت نے کہا"۔[23]

یہ عمل نہ صرف سیلو نواز کو موت سے بچالیتا ہے بلکہ موت کی اپنی سرشت کو بھی تحلیل کر دیتا ہے۔ وہ اب وہ نہیں رہتی جو کبھی تھی بلکہ اب وہ ایک ایسا وجود بن جاتی ہے جو مارنے سے پہلے محسوس کر سکتا ہے۔ ناول التوائے مرگ کے دوسرے حصے میں ساراماگو کا فن اپنی پوری تہذیبی و فکری شدت کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔ اگر ناول کا پہلا حصہ تہذیبی بحران اور ادارہ جاتی منافقت کا پردہ چاک کرتا ہے تو دوسرا حصہ محبت، فن اور انسانیت کی ناقابلِ تسخیر طاقت کا اعلان کرتا ہے۔ موت جو کبھی سب سے بڑی طاقت تھی، اب ایک حساس عورت ہے جو سیلو نواز کے ساتھ بستر میں لیٹی ہے نہ فاتح نہ مفتوح بلکہ محض ایک انسان۔ یہ محبت کوئی روایتی رومانی واردات نہیں بلکہ ایک وجودی بغاوت ہے ایک ایسا لمحہ جہاں انسان کی نرمی، فن کی قوت اور خاموشی کی شدت ایک ایسی مطلق حقیقت کو بھی جھکا دیتی ہے، جو ہمیشہ ناقابلِ تغیر سمجھی گئی۔

سیلو نواز کا کردار یہاں فنکار کا استعارہ بن جاتا ہے، جو سیاسی، مذہبی یا معیشتی اختیار نہیں رکھتا لیکن جس کے پاس ایک ایسی طاقت ہے جو نہ ریاست کے پاس ہے، نہ کلیسا کے پاس، نہ مافیا کے پاس؛ اور وہ ہے محبت، فن اور انسانیت۔ یہ فن وہ طاقت ہے جو موت کو بھی اس کی ذات سے منحرف کر دیتا ہے۔ یہ طاقت کے خلاف انسانی جذبے کی فتح کی علامت بن جاتی ہے۔ سیلو نواز یہاں ایک عام انسان کی نمائندگی کرتا ہے اس علامتی انجام میں ساراماگو، گویا اعلان کرتا ہے کہ زندگی اور موت کے درمیان سب سے مضبوط رشتہ طاقت یا قانون نہیں بلکہ محبت ہے وہ محبت جو انسان کو انسان بناتی ہے اور یہاں تک کہ موت کو بھی انسان کر دیتی ہے۔

حوزے ساراماگو کا ناول التوائے مرگ محض ایک فکری یا تمثیلی بیانیہ نہیں بلکہ بیانیہ فن کے حوالے سے ایک ایسا تخلیقی تجربہ ہے جو

Research Journal Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقیق

جلد نمبر06، شمارہ نمبر02، دسمبر- 2025

روایتی ناول نگاری کی حدود کو شعوری طور پر منہدم کرتا ہے۔ اسے صرف موضوعاتی یا نظریاتی سطح پر سمجھنا اس کی پیچیدہ فنی ساخت، بیانیہ تکنیک اور لسانی تجربات کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہوگا۔ یہ ناول اپنی اسلوبیاتی ندرت، جملوں کیبیی گی، نحوی شکست و ریخت اور علامتی نظام کے باعث جدید یورپی ناولیات میں ایک منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ التوائے مرگ بظاہر ایک نہایت سادہ پلاٹ پر مبنی ہے: "ایک دن لوگ مرنا بند ہو جاتے ہیں، پھر موت واپسی کا اعلان کرتی ہے اور آخر کار موت خود ایک انسان سے محبت کرنے لگتی ہے۔" یہ خلاصہ بظاہر کہانی کے خارجی ڈھانچے کو بیان کرتا ہے مگر درحقیقت یہ ایک نہایت پیچیدہ، تہذیبی اور تجریدی بیانیہ کا محض سطحی عکس ہے۔ ناول کا فکری کمال اسی سادگی میں پنہاں ہے جو رفتہ رفتہ ایک علامتی اور تہذیبی تجربے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

> ’’میرے ذہن میں ایک سوال آیا، 'اگر موت کسی خاص فرد کو ہلاک نہ کر سکے تو کیا ہوگا؟' یہ وہ چنگاری تھی جس سے اس ناول کا آغاز ہوا۔ میں نے کتاب کا آغاز پہلے حصے میں پیش آنے والے موت کے پورے ملک پر (وقفہ کرتے ہوئے) ضرب لگانے کے خیال سے نہیں کیا۔ یہ مرحلہ بعد میں۔۔۔ عمومی آئیڈیا کے بعد آیا۔‘‘[24]

ناول کا مرکزی نکتۂ آغاز ایک فرد کی موت کے تعطل کا سوال تھا جو آگے چل کر اجتماعی سطح کے بحران میں بدل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ التوائے مرگ کا بیانیہ واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ ایک مکمل سماجی و ریاستی بحران کا عکاس ہے جس میں مذہب، سیاست، معیشت اور اخلاقیات پر موت کے رک جانے کے اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے، جب کہ دوسرا حصہ یکسر تبدیلی اختیار کرتا ہے، جہاں کہانی صرف دو کرداروں موت اور سیلو نواز کے گرد گھومتی ہے۔ پہلا حصہ اجتماعی وجود کا استعارہ ہے تو دوسرا فرد کی داخلی نفسیات اور جذبات کا آئینہ۔ یہی تضاد اور ترکیب ناول کو ایک اعلیٰ فکری، استعاراتی اور فلسفیانہ بیانیہ بناتی ہے، جو پلاٹ کی سادگی کے باوجود قاری کو مسلسل متوجہ اور متحرک رکھتی ہے۔

التوائے مرگ میں حوزے ساراماگو نے زبان، جملہ سازی اور رموز اوقاف کے روایتی سانچوں سے مکمل انحراف کیا ہے۔ ان کا بیانیہ صرف ایک کہانی سنانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک لسانی تجربہ ہے جو قاری کو نہ صرف متن سے بلکہ زبان اور فکر کے باہمی رشتے سے بھی متعارف کرواتا ہے۔ ساراماگو کے ہاں جملے لمبے، مسلسل اور کسی واضح نحوی وقفے کے بغیر نظر آتے ہیں گویا وہ ذہنی بہاؤ کی طرز پر چل رہے ہوں لیکن ان میں جو الجھاؤ ہے وہ ویسا نہیں جیسا ہم ورجینیا وولف یا جوائس کے ہاں پاتے ہیں بلکہ یہ ایک منظم لسانی انتشار ہے، جو دانستہ طور پر قاری کے شعور کو متن کے اندر الجھاتا ہے۔ التوائے مرگ میں رموزِ اوقاف کی روایتی علامات جیسے ختمہ، واوین ("") اور بڑے حروف (Capital Letters) کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ مکالمے براہِ راست بیانیہ کے اندر ضم کر دیے گئے ہیں، بغیر کسی نشاندہی کے کہ کس جملے کا متکلم کون ہے۔ قاری کو ہر لمحہ یہ تجزیہ کرنا پڑتا ہے کہ کون بول رہا ہے، کون سوچ رہا ہے اور کون محض بیانیہ سنا رہا ہے۔ یہ اسلوب قاری کو ایک فعال تشریحی عمل میں شامل کر دیتا ہے جہاں سمجھنا محض معنی اخذ کرنا نہیں بلکہ زبان اور ساخت دریافت کرنا بھی لازم ہے۔

یہاں کہانی کی بنیادی سطح (یعنی موت کا غائب ہو جانا) تو سادہ ہے لیکن اسے بیان کرنے کا طریقِ کار ایسا ہے کہ قاری کو بارہا پیچھے جا کر سیاق وسباق کو از سرِ نو ترتیب دینا پڑتا ہے۔ مکالمہ، بیانیہ، داخلی خود کلامی اور خارجی مشاہدہ سب کچھ اکٹھا ایک ہی فقروں میں یوں بہتا ہے جیسے ندی کی تیز دھار، جس میں اگر ایک لمحہ دھیان بٹ جائے تو قاری بیانیہ کے دھارے سے نکل جاتا ہے۔ یہ طرزِ بیان کلاسیکی بیانیہ اصولوں کے خلاف ہے۔ روایتی ناول میں جملوں کی ساخت مختصر، رموزِ اوقاف واضح اور مکالمے قوسین یا واوین میں درج ہوتے ہیں لیکن ساراما گو ان سب کو شعوری طور پر ترک کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ایک مسلسل، بے سانس مگر رواں لسانی بہاؤ تشکیل پاتا ہے، اس طرزِ بیان میں امریکی Beat Writers کی جھلک بھی نظر آتی ہے، تاہم ساراما گو کا مقصد محض فنی جدت نہیں بلکہ ایک گہری فکری معنویت پیدا کرنا ہے۔

یہ اسلوب محض تکنیکی تجربہ نہیں بلکہ ایک شعوری انتخاب تھا۔ ساراما گو نے جان بوجھ کر ایسا طرزِ تحریر اپنایا تاکہ اپنے موضوعات میں سب کو برابر دکھا سکیں۔ ان کے ناولوں میں افراد، خداؤں اور جگہوں کے نام بڑے حروف (Capital Letters) سے نہیں لکھے جاتے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ زندگی کو مساوات پر مبنی دیکھتے تھے۔ جہاں کوئی ہستی یا مقام دوسرے سے برتر یا کمتر نہیں بلکہ سب ایک ہی سطح پر موجود ہیں۔ اس طرح ان کا بیانیہ نہ صرف جمالیاتی تجربہ فراہم کرتا ہے بلکہ ایک نظریاتی پیغام بھی دیتا ہے، جو برابری، انصاف اور اجتماعی انسانی وقار پر مبنی ہے۔

ناول التوائے مرگ میں کردار نگاری کی تکنیک اس کے مخصوص اسلوب کا تسلسل ہے۔ ناول میں کرداروں کو ناموں سے نہیں بلکہ ان کی صفات، پیشوں یا علامتی حیثیت سے شناخت دی جاتی ہے جیسے، یلو نواز، بادشاہ یا وزیر اعظم۔ اس تکنیک کا مقصد کرداروں کو ان کے انفرادی حوالوں سے ماورا کر کے عالمی یا علامتی سطح پر ابھارنا ہے۔ اس طرح کردار مخصوص سماجی یا تہذیبی رویوں کے نمائندہ بن جاتے ہیں، نہ کہ صرف ذاتی یا جذباتی زندگی کے حامل فرد۔ التوائے مرگ میں موت بذات خود ایک مرکزی کردار ہے، جو نہ صرف انسانی صورت اختیار کرتی ہے بلکہ جذبات واحساسات سے دوچار ہو کر انسانی محبت میں گرفتار بھی ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف سیلو نواز ایک ایسا بے نام، تنہا اور شفاف کردار ہے جس کے ساتھ موت کی محبت اسے ایک غیر متوقع بحران سے آشنا کرتی ہے۔ یہاں کردار اپنی اصل شناخت سے بڑھ کر علامت بن جاتے ہیں موت فقط ایک طبیعی عمل نہیں بلکہ اقتدار، بے حسی، سرد مہری اور نظم کا استعارہ ہے، جب کہ سیلو نواز انسانی جمالیات، تخلیق اور جذباتی حرارت کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ساراما گو اس بے نامی کے ذریعے فرد اور ادارے، جذبات اور اختیار، زندگی اور نظام کے درمیان فاصلہ پیدا کرتا ہے اور اس فاصلے میں ہی وہ اپنے قاری کو اخلاقی وجودی اور تہذیبی سوالات کی پرتوں میں جھانکنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح التوائے مرگ کی کردار نگاری روایتی پلاٹ یا نفسیاتی تجزیے سے ہٹ کر ایک فلسفیانہ وعلامتی ڈھانچے میں پروئی گئی ہے، جو جدید ناول کی فنی شعریات کا حصہ ہے۔

یوں ساراما گو کے اس ناول کا پیغام دوہرا ہے ایک طرف وہ جدید سرمایہ دارانہ نظام کے نقاب کو چاک کرتا ہے، دوسری طرف انسانیت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جو موت کے بغیر محض نفع ونقصان کی مشق بن کر رہ جاتے ہیں۔ کلیسا جیسا روحانی ادارہ، جو زندگی بعد از مرگ کے عقائد کا علمبردار ہے، موت کی عدم موجودگی سے تھیالوجیکل بحران میں مبتلا ہو جاتا ہے اور خود موت کی واپسی کے لیے گڑگڑانے لگتا ہے۔

ریاست، جو سماجی نظم و نسق کی ذمہ دار ہے، بیوروکریسی کے لاحاصل فیصلوں میں الجھ کر بحران سے نظریں چراتی ہے۔ جب کہ سرمایہ دارانہ معیشت اس خلا کو پُر کرنے کے لیے موت کو بھی ایک نفع بخش کاروبار میں بدل دیتی ہے۔ تجہیز و تکفین کے کاروباری، بیمہ کمپنیاں اور بالآخر "مافیا" موت کی غیر موجودگی سے جنم لینے والے خلا کو اپنے مالی مفادات سے بھرنے لگتے ہیں۔ ساراماگو کا اسلوب، جس میں طنز، تجرید اور علامت کی آمیزش نمایاں ہے، قاری کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ موت کو صرف ایک حیاتیاتی اختتام نہیں بلکہ ایک نظمِ اجتماعی کے ضروری عنصر کے طور پر سمجھے۔ یوں یہ ناول موت کے معطل ہو جانے کو ایک علامتی سطح پر انسانی تہذیب کی داخلی شکست، اخلاقی جمود اور ادارہ جاتی کھوکھلے پن کا استعارہ بنا دیتا ہے۔

اس تنقیدی مطالعہ کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول التوائے مرگ میں موت کا تعطل محض ایک تخیلاتی مفروضہ نہیں رہتا بلکہ جدید تہذیب کے اخلاقی، روحانی اور ادارہ جاتی کھوکھلے پن کو بے نقاب کرنے والا علامتی بیانیہ بن جاتا ہے۔ حوزے ساراماگو اس تصور کے ذریعے یہ واضح کرتے ہیں کہ جب موت جیسی فطری اور ناگزیر حقیقت معطل ہو جائے تو مذہب، ریاست، معیشت اور سماجی ادارے اپنی معنویت اور اخلاقی بنیاد کھو بیٹھتے ہیں۔ اس طرح یہ ناول جدید سرمایہ دارانہ تہذیب کے اس بنیادی تضاد کو آشکار کرتا ہے جس میں زندگی اور موت دونوں کو مفاد، طاقت اور منڈی کے تابع کر دیا گیا ہے اور یوں انسانی تہذیب اپنے ہی بنائے ہوئے نظاموں کے ہاتھوں زوال پذیر ہو جاتی ہے۔

حوالہ جات

1۔ حوزے ساراماگو، التوائے مرگ، مترجمہ: مبشر احمد میر (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 2017)، 11۔

2۔ ساراماگو، التوائے مرگ، 16۔

3۔ ساراماگو، التوائے مرگ، 17۔

4۔ مبشر احمد میر، مشرق و مغرب کے ادیبوں کی (لاہور: کتابی دنیا، 2024)، 84۔

5۔ ساراماگو، التوائے مرگ، 22۔

6۔ ساراماگو، التوائے مرگ، 23۔

7۔ ساراماگو، التوائے مرگ، 28۔

8۔ ساراماگو، التوائے مرگ، 28۔

9۔ ساراماگو،التوائے مرگ،29۔

10۔ ساراماگو،التوائے مرگ،24۔

11۔ ساراماگو،التوائے مرگ،27-28۔

12۔ ساراماگو،التوائے مرگ،34۔

13۔ ساراماگو،التوائے مرگ،41۔

14۔ ساراماگو،التوائے مرگ،51۔

15۔ ساراماگو،التوائے مرگ،17۔

16۔ ساراماگو،التوائے مرگ،32۔

17 . Kundu, Devaleena. "Transacting Death: José Saramago's Death at Intervals and the Politics of the Death Industry." *Thanatos* 12, no. 1 (2025): 1.

18۔ ساراماگو،التوائے مرگ،64۔

19۔ ساراماگو،التوائے مرگ،64۔

20 . Tania Jones, "Death and the Young Man: Saramago's Death with Interruptions and the Allegorical Refiguration of Mortality," *Thanatos* 4, no. 1 (2015): 91–104.

21۔ ساراماگو،التوائے مرگ،109-114۔

22۔ ساراماگو،التوائے مرگ،145۔

23۔ ساراماگو،التوائے مرگ،174۔

24۔ میر،مشرق و مغرب کے ادیبوں کی،84۔